Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN ONLINE 2790-9972
VOL 6, Issue 4
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com
Research Article

ڈاکٹر عبدالواجد تبسم
اسسٹنٹ پرفیسر اردو شعبہ پاکستانی زبانیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
ڈاکٹر سعدیہ عزیز
اسسٹنٹ پرفیسر شعبہ تاریخ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

تصوراتِ اقبال سلیم احمد کی نظر میں

Dr. Abdul Wajid Tabassum
Assistant Professor, Urdu Department Pakistani Languages ,Allama Iqbal Open University, Islamabad
Dr. Sadia Aziz
Assistant Professor, Department of History, Allama Iqbal Open University, Islamabad

Iqbal's Concepts In The View Of Saleem Ahmed

Received: Oct 13, 2025
Accepted: Nov 23, 2025
Published: Dec 30, 2025

Salim Ahmed is one of the important critics of Iqbaliat. In his book Iqbal as a poet, he has tried to look at Iqbal's ideas and thoughts in a different way and has also raised objections to it. He has described Iqbal's basic concept of self with reference to Surah Ikhlas, while his poetry has been described as the poetry of the cobbler's door. The article under consideration is a critical analysis of these two articles.

Keywords: Iqbal's Philosophy, Saleem Ahmed's Criticism, Concept Of Khudi, Islamic Thought, Modern Urdu Criticism, Intellectual Interpretation, Poetic Ideology

" اقبال۔ ایک شاعر" سلیم احمد کی اقبال کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے، جس میں انھوں نے اقبال کے نظریات اور افکار کو مختلف انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب کے دو نہایت اہم مضامین، "اقبال کا سورہ اخلاص" اور "موچی دروازے کی شاعری" ہے۔اولین مضمون میں سلیم احمد نے اقبال کے بنیادی نظریہ خودی کو "سورہ اخلاص" کی صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ اسے بھی اقبال کی شاعری اور فکر کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خودی اقبال کی شاعری کا اہم ترین مسئلہ کیوں ہے؟ حقیقت میں اقبال ہیں تو کچھ بننا کچھ اور چاہتے ہیں۔ وہ فلسفی اور شاعر ہیں مگر عملی آدمی بننا چاہتے ہیں۔ پہلی رات کے چاند ہیں مگر بدر کامل بننا چاہتے ہیں۔ان کی خودی خدا کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتی ہے۔

خودی اور خدا کی بحث میں سلیم احمد نے عکس اور آئینے کی مثال دی ہے کیونکہ اقبال کی خودی (عکس) بھی خدا (آئینہ) میں کبھی ضم نہیں ہوتی۔ان کا سوال ہے کہ اقبال کی شخصیت میں خودی سے وابستگی ان کی شاعری سے کیا تعلق رکھتی ہے؟ سلیم احمد کے خیال میں:

''اقبال جب نفی خودی کی بجائے اثبات خودی پر زور دیتے ہیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟...... اس کا مفہوم یہ ہے کہ اقبال ذات سے گریزاں ہیں اور صرف شخصیت کو تقویت دینا چاہتے ہیں۔''(۱)

....

خودی اقبال کی شخصیت کا حقیقی پہلو ہے جب کہ خدا مثالی پہلو۔ خودی سے خدا تک پہنچنے کے تمام تکمیلی مراحل تعمیر خودی کے مراحل ہیں۔ اطاعت اور ضبط نفس سے گزرتے ہوئے نیابت الٰہی کے درجہ میں پہنچ کر خدا بندے میں جذب ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان کا مثالی پہلو اس کا حقیقی پہلو بن جاتا ہے۔ اقبال کے شارحین کچھ بھی کہیں لیکن اقبال کا تصور خودی اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

نفی خودی سے بے عملی پیدا ہوتی ہے جب کہ عمل کا تقاضا اثبات خودی ہے۔ یقینی طور پر ایک غلط خیال ہے۔ نفی خودی فنا کو قبول کر کے موت سے پہلے موت سے ہم آہنگ ہو جانے کا عمل ہے۔ وہ اس فانی زندگی سے جو آدم کی تقدیر ہے، خوشی خوشی گلے ملنے کا نام ہے۔ نفی خودی ہماری نا مطمئن زندگی کے اعمال کو روک کر ایک نئے عمل کا دروازہ کھولتی ہے۔ یہ زندگی کی قبولیت کا عمل ہے۔ یہ بے اطمینانی سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سر تا سر اطمینان اور سکون کی پیداوار ہے۔ اسی نفی خودی کی بدولت وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو ''بقا باللہ'' کا مقام ہے۔ اقبال چند صوفیانہ خیالات کی مدد سے اس مقام تک پہنچتے تو ہیں مگر اس کی تہ میں نہیں اتر سکتے۔

شاعری شخصیت سے ذات کی طرف مراجعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی بنفسہ نفی خودی کا عمل ہے۔ اقبال کی حقیقی خودی کا اثبات ان کی شاعری میں ہے۔ یعنی شخصیت سے ذات کی طرف سفر میں۔ اس سفر کے ذریعے ہی اقبال، اقبال بنتے ہیں اور اپنے باطن کی عمیق گہرائیوں کی آگاہی کے ساتھ ایک ایسی تخلیقی زندگی بسر کرتے ہیں جو دنیا کے عظیم ترین شاعروں کی حقیقی زندگی ہے۔

سلیم احمد نے اقبال کے تصور خودی کو اگرچہ بڑی صحت اور بصیرت سے بیان کیا ہے مگر آگے چل کر اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ایک یہ کہ اگر اقبال کا تصور خودی عجمی تصوف فنا فی اللہ کی مخالفت میں ہے جب بھی غلط اور اگر یہ ''بقا باللہ'' پر زور دیتا ہے تب بھی غلط۔ کیوں کہ بقول سلیم احمد ان دونوں اصطلاحات کے صحیح مفہوم سے نا آشنا معلوم ہوتے ہیں اس لیے انھوں نے ان اصطلاحات کے غلط مفہوم کی روشنی میں اپنا تصور خودی پیش کیا ہے۔

سلیم احمد کی مندرجہ بالا بات اگر صحیح ہے تو اقبال کا تصور خودی یقیناً غلط ہے۔ بشرطیکہ اقبال نے اپنا تصور خودی فنا فی اللہ کی مخالفت اور بقا باللہ کی موافقت میں پیش کیا ہے۔ حقیقت میں عجمی تصوف کے منفی اثرات جو ہندوستانی مسلمانوں کی زندگیوں میں اس دور میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے پیش نظر خود شناسی اور خود آگاہی کے جذبے کو اکسانا اور جوہر ذات کو نمایاں کرنے کی ترغیب دینا وقت کا اہم تقاضا تھا۔ اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کو تصوف کی خودی اور بیخودی سے الگ رکھا ہے اس لیے اسے تصوف کی اصطلاحوں کے ساتھ رکھ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔

اقبال کے ہاں خودی کے اثبات واستحکام پر جو زور ہے اس کا مطلب سلیم احمد یہ بتاتے ہیں کہ اقبال ذات سے گریزاں ہیں اور صرف شخصیت کو تقویت دینا چاہتے ہیں۔ اگر سلیم احمد کے خیال کے مطابق وجود کے حقیقی پہلو کا نام ذات ہے اور مثالی پہلو کا نام شخصیت یعنی ہم جو کچھ ہیں وہ ہماری ذات ہے اور ہم جو کچھ بننا چاہتے ہیں وہ شخصیت تو ان معنوں میں ذات اتنی قابل قدر نہیں رہتی جتنی کہ شخصیت بن جاتی ہے۔ اب اگر ذات اور شخصیت کا فرق کچھ اسی قسم کا ہے تو سلیم احمد کا یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ شاعری شخصیت سے ذات کی طرف مراجعت سے پیدا ہوتی ہے یعنی نفی خودی کا عمل ہے۔ اگر فطری کمی یا کمزوری کا دوسرا نام ذات ہے اور اکتسابی خوبی کا دوسرا نام شخصیت تو انسان ذات سے گریزاں ہو کر شخصیت کو تقویت کیوں نہ پہنچائے۔ کیا ماحول سے تعلق پیدا کرنے کے لیے ذات پر شخصیت کا خول چڑھانا ضروری ہے۔ یہ بات بھی دریافت طلب ہے کہ عمل کا تقاضا اثبات خودی ہے یا اثباتِ خودی کا تقاضا عمل۔

سلیم احمد اس مضمون میں بھی اس مفروضے کے تحت کہ اقبال کی شاعری اس وقت پیدا ہوگی جب وہ اپنی شخصیت سے ذات کی طرف سفر کریں گے، ساری بحث اٹھائی ہے۔ اقبال کا یہ سفر نفی خودی کا نتیجہ ہے نہ کہ اثبات خودی کا۔ سلیم احمد چونکہ نفی خودی کو تسلیم کرتے ہیں اس لیے وہ اقبال کے اثبات خودی کو ایک غلط فلسفہ قرار دیتے ہیں۔ اس سے اقبال کے فلسفے کی ساری عمارت زمین پر آ رہی ہوتی ہے۔

سلیم احمد کہتے ہیں کہ نیابت الٰہی کے جذبے سے گزر کر خدا بندے میں جذب ہو جاتا ہے حالاں کہ ایسا نہیں۔ انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا کرنے کی سعی کرے۔ اخلاق الٰہیہ، صفات الٰہیہ ہی ہیں اور صفات کو ذات سے جدا نہیں کر سکتے۔ اس مسئلے کو مولانا روم اس طرح واضح کرتے ہیں کہ لوہا آگ میں رہ کر آگ کا ہم شکل اور بہت حد تک اس کا ہم صفت ہو جاتا ہے۔ بہت سے کام جو آگ کر سکتی ہے وہ ایسی حالت میں لوہا بھی کر سکتا ہے۔ اس ہم صفتی کے باوجود خالق و مخلوق کا ذاتی امتیاز باقی رہے گا۔

نیابت الٰہی کے درجے پر پہنچنے کے بعد خدا بندے میں جذب نہیں ہوتا بلکہ خدا کی بعض صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔ بندہ جو فعل کرتا ہے اس کے اس فعل میں اور خدا کے فعل میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

جہاں تک نفی خودی کا تعلق ہے تو اقبال نے اس کی مخالفت کی ہے بقول اقبال یہ انحطاط یافتہ اور مغلوب اقوام کی ایجاد ہے۔ جن اقوام کے قوائے حیات کمزور پڑ جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو قوی اقوام کے مقابلے میں زندہ رہنے کی کوئی ترکیب سوچتے ہیں جس سے ان کی کمزوری ذلت کی بجائے فضیلت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہمت کو دنیا طلبی اور عجز کو روحانیت کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔

اقبال نے کہیں عجمی تصورات کو، کہیں افلاطونی نظریات کو اسلام کی بیخ کنی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ یہود و نصاریٰ اور بعض عجمی گروہوں نے اسلام کی بیخ کنی کے لیے ایسے تصورات کو فلسفے اور تصوف کے انداز میں پیش کیا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو زندگی کی جدوجہد سے باز رکھنا، قناعت پرستی، لذت پرستی اور سکون پرستی تھا۔ کسی قوم کا ادب اس کی زندگی اور اس کی تمناؤں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب قوم پست ہمت ہو جائے تو ادب میں زندگی کی گرمی اور عمل کا جوش نظر نہیں آتا اسی وجہ سے اقبال نے جوش اصلاح میں حافظ پر تنقید کی۔

سلیم احمد کے اس مضمون سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اقبال کی شاعری میں تجربے اور فکر کو دو علیحدہ اکائیوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کو تو زیر بحث لاتے ہیں مگر ان کی فکر کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس ثنویت سے نتائج کا استخراج صحیح معنوں میں نہیں ہو سکتا۔ تخلیقی سطح پر اقبال جیسی مربوط شخصیت کا اس طرح اکائیوں کی صورت میں مطالعہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اقبال کی شاعری، فکر اور شخصیت میں جو کلیت پائی جاتی ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

موچی دروازے کی شاعری:

''اقبال-ایک شاعر'' کا دوسرا اہم مضمون ''موچی دروازے کی شاعری'' ہے۔ مضمون کا آغاز سلیم احمد نے اس مفروضے سے کیا ہے کہ فیض صاحب نے اقبال کو موچی دروازے کا شاعر کہا ہے۔ اس لیے وہ بھی انھیں ایسا کہنے سے نہیں ڈرتے۔

''فراق صاحب نے کسی جگہ لکھا ہے کہ لکھے پڑھے غیر مسلمان لوگ ''شکوہ'' کو تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیتے ہیں لیکن ''جواب شکوہ'' سن کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگتے ہیں۔ میں (سلیم احمد) اس معنی خیز مسکراہٹ میں تحقیر آمیز طنز کا اور اضافہ کرتا ہوں ''یہ کوئی شاعری ہے جو مسلمانوں کا رونا دھونا کرتی رہتی ہے''۔''(۲)

بقول سلیم احمد بہت سے پڑھے لکھے مسلمان ''شکوہ'' اور اسی قسم کی دوسری شاعری کا نام سن کر ہنسنے لگتے ہیں۔ سلیم احمد کا خیال ہے کہ باقی شاعری سے قطع نظر ''شکوہ'' کی سب سے بڑی خوبی یا خرابی یہ ہی ہے کہ یہ خالص مسلمانوں کی چیز ہے۔ اس کے فکری و فنی پہلوؤں پر بات کرتے ہوئے سلیم احمد کہتے ہیں کہ اقبال کا موضوع تو بہت وسیع ہے اور مسلمانان عالم پر پھیلا ہوا ہے لیکن ''شکوہ'' میں اقبال اسے فنی حسن کے ساتھ ادا نہیں کر سکے۔ تاہم یہ نظم ''موچی دروازے'' کی علامتی صورت میں مسلمانانِ برصغیر کے دلوں کی دھڑکن ہے۔ اسے فیض یا فراق نہیں سمجھ سکتے۔

سلیم احمد نے یہاں ایک سوال اور اٹھایا ہے کہ کیا کوئی شاعری کسی خاص قوم سے تعلق رکھ کر چھوٹی شاعری ہو جاتی ہے؟ کیا اقبال اگر مسلمانوں کے لیے شاعری نہ کرتے تو زیادہ بہتر اور بڑے شاعر ہوتے؟ سلیم احمد کا تجزیہ ہے:

''آفاقیت کی وسعت پہلے ایک محدودیت کا تقاضا کرتی ہے۔ سچی آفاقیت اس محدودیت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی بہر حال ''شکوہ'' کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ محدودیت کا اظہار کرتا ہے۔''(۳)

اسی زمانے میں بقول فاضل مصنف تصوف کے وہ رجحانات ابھرے جنھوں نے اسلامی کائنات کو مکمل طور پر منہدم ہونے سے بچا لیا۔ تصوف کے یہ وہی رجحانات تھے جن کے خلاف اقبال ہمیشہ آواز اٹھاتے رہے۔ کیونکہ وہ اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے کہ اسلامی کائنات کو بچانے میں تصوف نے کیا کردار ادا کیا۔

''شکوہ'' کے بارے میں سلیم احمد کا خیال ہے کہ اس میں تجربے کی شدت اور گہرائی بیان کرنے کی بجائے اقبال صرف ''متاب سخن'' کی داد وصول کرنا چاہتے ہیں۔ ''شکوہ'' ایک بڑے موضوع پر ایک چھوٹی مگر منفرد تخلیق ہے۔ البتہ انھیں اس بات کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے مسلمانوں کے ایک زبردست اجتماعی تجربے کو ان کے عقائد کے مابعد الطبیعیاتی پس منظر میں رکھ کر دیکھا اور خاکم بدہن کہہ کر اس سے پیدا ہونے والے سوالات اور رویوں کا اظہار کر دیا یہ الگ بات ہے کہ یہ تجربہ اقبال کے اندر کوئی دہشت ناک استعجاب پیدا کرنے کے بجائے ایک قسم کی شوخ بیانی کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

اقبال ''شکوہ'' میں رحمت کے طالب نہیں ہیں بلکہ اپنا حق الخدمت مانگتے ہیں۔ ''شکوہ'' کی تخلیق میں اقبال کی مخصوص نفسیات کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اقبال اگر تصوف کی روایت سے زیادہ گہرا اثر لیتے تو کیا اس سے ''شکوہ'' کے بجائے صبر و رضا کی کیفیت نہ پیدا ہوتی؟

اقبال تصور کائنات کو بحال کرنے میں جس کی ٹوٹ پھوٹ سے ان کا ''شکوہ'' پیدا ہوا ہے دوبارہ پھر نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس پر لوٹ آتے ہیں اور اپنی عمل پرستی کے بجائے گویا ''شفاعت'' کے روایتی تصور کا سہارا لیتے ہیں۔

''شکوہ'' کی روحانی ضرورت اقبال نے پہلے اپنی روح میں محسوس کی پھر جب وہ تخلیقی فن پارے میں ڈھل گئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک اجتماعی ضرورت ہی تھی۔

''شکوہ'' میں عہد شکنی کی نسبت خدا کی طرف تھی ''جواب شکوہ'' میں مسلمانوں کی طرف ہو گئی۔ ''شکوہ'' سے اقبال پر کفر کا فتویٰ لگا ''جواب شکوہ'' سے وہ عاشق رسولؐ اور حکیم الامت کہلائے۔ اس طرح اقبال کی بھی نجات ہو گئی اور موچی دروازے کے مسلمانوں کی ضرورت بھی پوری ہو گئی۔

''شکوہ''، ''جواب شکوہ'' پر مرثیے کی روایت کا گہرا اثر موجود ہے اس کا انداز بیان میر انیسؔ کی یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح دوسری روایت واسوخت کی ہے۔ سلیم احمد کا کہنا ہے:

''شکوہ پر اس روایت کا اتنا گہرا اثر ہے کہ میں نے (سلیم احمد) ایک مرتبہ ''شکوہ'' کو روحانی یا مذہبی واسوخت کہا تھا۔''(۴)

مضمون کے آخر میں ''شکوہ'' ''جواب شکوہ'' کو قومی وارداتِ قلب کہتے ہوئے سلیم احمد دعا کرتے ہیں:

''کاش آج ہمارے درمیان موچی دروازے کا کوئی اور شاعر موجود ہوتا۔''(۵)

سلیم احمد نے جس مفروضے کو بنیاد بناتے ہوئے یہ مضمون لکھا ہے یعنی فیضؔ کا کہنا کہ اقبال موچی دروازے کا شاعر ہے تحریری طور پر موجود نہیں۔ محض ایک کلیے کو بنیاد بنا کر اتنی بات کہہ دینا کہاں تک درست ہے اور ایسا کلیہ کہ جو تحریری طور پر بھی موجود نہیں۔ فیض کی اگر کوئی تحریر (۶) جو خاص طور پر اقبال کے حوالے سے لکھی بھی گئی ہے تو ان کا رویہ اس طرح کا نہیں ہے جس طرح سلیم احمد بیان کرتے ہیں۔

سلیم احمد نے دوسرا حوالہ فراق کے حوالے سے دیا ہے کہ فراق نے کسی جگہ لکھا ہے۔ اب کسی جگہ سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت ہونی چاہیے۔ سلیم احمد نے اپنی کتاب ''اقبال-ایک شاعر'' کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں جہاں معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے وہاں اس بات کی بھی وضاحت ہونی چاہیے تھی کہ فیضؔ اور فراقؔ نے اقبال پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کے حوالہ جات کہاں موجود ہیں مگر فاضل مصنف اس سے کنی کترا گئے۔

''شکوہ'' کے فکری و فنی پہلوؤں کے حوالے سے فاضل مصنف کا یہ کہنا کہ اقبال اتنے بڑے موضوع کو فنی حسن کے ساتھ ادا نہ کر سکے کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں سید عابد علی عابد رقمطراز ہیں:

''اقبال کی طویل نظموں میں ''شکوہ'' کئی طرح اہم اور معنی خیز ہے ایک تو یہ کہ اس کی ساخت اور تشکیل میں اقبال نے پہلی بار اس صنعت گری کی ایک جھلک دکھائی ہے جسے بعد کی نظموں میں عروج کمال پر پہنچنا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس نظم میں محسنات شعر کا استعمال ایسی چابکدستی اور ہنرمندی سے ہوا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ بیشتر مطالب پر ہی مرکوز رہتی ہے۔''(۷)

آگے چل کر فاضل مصنف خود اس بات کی تائید کرنے لگتے ہیں کہ:

''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' مسلمانوں کی ایک ایسی اجتماعی ضرورت تھی جسے نہ فیض صاحب سمجھ سکتے ہیں، نہ فراق صاحب۔ اسے سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ اس دل کی ضرورت ہے جو موچی دوازے کے مسلمانوں کے سینے میں دھڑکتا ہے۔''(۸)

جہاں تک ''شکوہ'' کی محدودیت کا تعلق ہے تو پہلے اس بات کی وضاحت ہونی چاہیے کہ ہم آفایت سے کیا مراد لیتے ہیں۔ آفاقیت کا ہمارے نزدیک یہی مطلب ہے کہ ایسا نکتہ نظر جو کسی خاص انسانی گروہ، رنگ و نسل، نام و نسب اور ملک و قوم کے ظاہری اور مصنوعی امتیازات کے محدود دائروں سے نکال کر ایک وسیع ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل کرے۔ اقبال کے نزدیک یہ ہیئت اجتماعیہ قائم کرنا اسلام کا نصب العین ہے۔ اسلامی تعلیمات عالمگیریت کی حامل ہیں اور اسلام تمام نوع انسانی کو اخوت کی لڑی میں پرو کر ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کے قیام کی دعوت دیتا ہے۔ چونکہ اقبال کے دل و دماغ میں یہ اسلامی نکتہ نظر راسخ ہو چکا ہے اس لیے وہ اسی کا پرچار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ اقبال تصوف کے جن رجحانات کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے ہی اسلامی کائنات کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بقول فاضل مصنف اقبال اسے صحیح معنوں میں سمجھ نہ سکے۔

اقبال نے تصوف کے جن عناصر پر تنقید کی ہے اور جس کی وجہ سے حافظ کی شاعری پر بھی انھوں نے اعتراض کیا ہے اس کی بنیادی وجہ ان کے کلام میں لذت پرستی اور عمل سے گریز ہے۔ اس میں سکون پرستی اور قناعت کوشی کی تعلیم ہے۔ اس کے پڑھنے سے انسان کی خودی میں کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کے تصوف پر زیادہ تر وحدت الوجود کے اثرات ہیں۔ اقبال نے عشق و خودی کے نظریات اور کیفیات کو بیان کرتے ہوئے اس سے گریز کیا ہے۔

اقبال کے بارے میں عام طور پر یہ رائے دی جاتی ہے کہ وہ تصوف کے مخالف ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے صوفیہ کے خلاف لکھے ہوئے اردو اشعار کے علاوہ ''اسرار خودی'' کے ان فارسی اشعار کو بھی بطور مثال دیا جاتا ہے جو انھوں نے حافظ شیرازی کے بارے میں لکھے حالانکہ ایسا نہیں۔ اقبال عجمی تصوف کی مخالفت اور اسلامی تصوف کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عجمی تصوف اسلام کی روح کے سراسر خلاف تھا۔ ان کے نزدیک عجمی تصوف نے قنوطی لٹریچر پیدا کیا جو قوموں کو مردہ بنا دیتا ہے۔ اقبال اپنے ایک خط بنام محمد اسلم جیراج پوری میں لکھتے ہیں:

''تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرون اولی میں پایا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے...... اور نظام عالم کے حقائق اور باری تعالی کی ذات کے متعلق موشگافیاں کرکے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔'' (۹)

اقبال اسلامی تصوف میں شامل بعض عجمی عناصر کو موضوع تنقید بناتے ہیں کہ جنھوں نے قوم سے قوت عمل چھین لی ہے اور انھیں سکون پرستی کی طرف مائل کیا ہے۔ ایسے عناصر قوموں کے لیے کیسے سود مند ہو سکتے ہیں۔ اب فاضل مصنف کا کہنا کہ اقبال نے تصوف کو نہ سمجھتے ہوئے ان عناصر پر تنقید کی ہے کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ فاضل مصنف آگے چل کر اقبال کے ''شکوہ'' پر بیک وقت درج ذیل اعتراضات کرتے ہیں:

۱۔ ''شکوہ'' کا تجربہ اقبال کے اندر دہشت ناک استعجاب پیدا کرنے کی بجائے شوخی بیان کی تحریک پیدا کرتا ہے۔
۲۔ اقبال ''شکوہ'' میں رحمت کے طالب نہیں بلکہ اپنا حق خدمت مانگتے ہیں۔
۳۔ اقبال اگر تصوف کی روایت کا گہرا اثر لیتے تو ان میں صبر و رضا کی کیفیت پیدا ہوتی۔
۴۔ اقبال ''جواب شکوہ'' میں عمل پرستی کی بجائے حضور ﷺ کی شفاعت کے روایتی تصور پر آ جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض یہ کہ ''شکوہ'' کا تجربہ اقبال کے اندر کوئی دہشت ناک استعجاب پیدا نہیں کرتا کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''اقبال کے شکوے کا لہجہ...... متنوع ہے۔ کہیں عجز و نیاز مندی ہے، کہیں اپنی غیرت و انا کا احساس ہے، کہیں تندی و تلخی اور جوش ہے، کہیں تاسف و مایوسی کا لہجہ ہے اور کہیں زاری و دعا کا انداز ہے۔'' (۱۰)

''شکوہ'' میں اقبال کے لب و لہجہ کے اتار چڑھاؤ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقبال صحیح معنوں میں تجربے کی گہرائی تک اترتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اقبال تصوف کی روایت کا گہرا اثر لیتے تو ان میں صبر و رضا کی کیفیت پیدا ہوتی۔ اقبال نے تصوف کے اسی نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے خودی کا تصور پیش کرتے ہوئے عمل کی دعوت دی ہے۔ وہ تو صبر و رضا سے بچتے ہوئے تگ و دو کا درس دیتے ہیں اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اقبال اسی روایتی تصوف کو کیسے تسلیم کرتے۔

رہی بات حضور ﷺ کی شفاعت کی تو حضور ﷺ تخلیق وجہ کائنات ہیں۔ فکر و عمل کی انتہا ان کی ذات میں جمع ہے۔ اب اقبال حضور ﷺ سے فکر و عمل کی شفاعت طلب نہیں کریں گے تو کس سے کریں گے۔

رہی بات حق خدمت کی تو اقبال نے ''شکوہ'' میں مسلمانوں ہی کے شکوہ شکایت کو جگہ دی ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا عام تاثر ہی یہ ہی تھا کہ ہم خدا کے نام لیوا ہیں۔ ہم نے اس کے پیغام کو ساری دنیا میں پہنچایا ہے مگر اس کے باوجود دنیا میں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں، گویا ایک اجتماعی شعور تھا جسے اقبال نے اپنے شکوے میں جگہ دی ہے۔ پھر ''جواب شکوہ'' میں ان برائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی بدولت ذلت ان کا مقدر بن چکی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ''اقبال کا سورہ اخلاص''، مشمولہ ''اقبال-ایک شاعر'' لاہور، توسین، ۱۹۸۷، ص:۹۷

۲۔ ''موچی دروزے کی شاعری''، مشمولہ ''اقبال-ایک شاعر''، ص:۳۸

۳۔ ایضاً، ص:۴۸

۴۔ ایضاً، ص:۵۹

۵۔ ایضاً، ص:۷۹

۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، فیض احمد فیض، ''محمد اقبال''، مشمولہ ''علامہ اقبال حیات فکر و فن'' (۱۰۱ مقالات)، مرتبہ سلیم اختر، ڈاکٹر، (لاہور، سنگ میل، س ن)

۷۔ سید عابد علی عابد، ''شکوہ-ایک سلسلہ خیال کا تجزیہ''، مشمولہ ''نفائس اقبال''، مرتبہ شیما مجید، لاہور، اقبال اکادمی، ۰۹۹۱ء، ص:۷۵

۸۔ ''اقبال-ایک شاعر''، ص:۱۸۴

۹۔ اقبال، ''کلیات مکاتیب اقبال''، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی، اردو اکادمی، جلد دوم، طبع دوم، ۳۹۹۱ء، ص:۳۹-۴۹

۱۰۔ رفیع الدین ہاشمی، ''اقبال کی طویل نظمیں''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۳۹۹۱ء، ص:۰۴